کچھ "لہو الحدیث" کی گذشتہ بحث سے متعلق

ایک خط اور اس کا جواب

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

(۱)

برادر محترم نعیم صدیقی صاحب - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

اپریل ۱۹۸۶ء کے ترجمان القرآن میں "لہو الحدیث" کی تشریح و وضاحت کرتے ہوئے آپ کے لب و لہجہ میں حسرت و یاس کی کیفیت نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔

لہو الحدیث کے بارے میں آپ کی وضاحت درست ہے، آپ کا موقف صحیح ہے۔ آپ کی دلیل مؤثر ہے "حدیث دلبراں" کو جو درحقیقت دعوت و تبلیغ کی بات ہی ہے۔ افسانہ و ناول کے پیرایۂ دل پذیر میں "حدیثِ دیگراں" بنا کر پیش کرنے کا آپ کا استدلال بھی بے حد معقول ہے۔ اسلامی تحریک کے لیے ادب کی قوتِ فکری دعوت کے نفوذ و توسیع میں کس درجہ مؤثر کردار ادا کرتی ہے اسے بھی آپ نے بہت اچھی طرح کھول دیا ہے لیکن میرے لیے سب سے بڑی دلدوز چیز آپ کا وہ لہجہ ہے جس میں حسرت و یاس کا رنگ جھلک گیا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے:

"میں نے ایک لمبا دور دعوتِ اسلامی اور تحریک اسلامی کے ساتھ گذار کر یہی اندازہ کیا ہے کہ ادب کو ہمارے حلقوں میں کوئی وقعت حاصل نہیں ہے۔ ادبی کام کرنے والوں کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اگر کچھ دوست ادب سے دلچسپی دکھاتے ہیں تو زیادہ تر مروۃً اور وہ بھی سرسری یا (بائی دی وے)

اس سلسلے میں چونکانے کی کوششیں کی گئیں، مگر دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام رہا۔ اب مجھے یہی تشویش ہے کہ کچھ عرصہ بعد اس پسپائی کا احساس ہوگا جو ادبی کام کی کوتاہی کی وجہ سے غیر محسوس طور پر واقع ہو رہی ہے۔ آخر ایک نہ ایک دن اس کی تلافی کا جذبہ بیدار ہوگا۔"

میں آپ کو تحریکِ اسلامی میں اسلامی ادب کی تحریک کا سالارِ کارواں سمجھتا ہوں۔ آپ نے اسلامی ادب کی اس وادیٔ پُرخار میں جہاں انسانی قدموں نے راستے متعین نہ کیے تھے، سب سے پہلے راستے بنائے اور تجربات کیے۔ افسانے کا اسلامی تصور کیا ہے؟ شعر و سخن کو لہو الحدیث بن جانے سے کیسے بچایا جا سکتا ہے؟ افسانہ و ناول کی اصناف کو اخلاقی اقدار کے فروغ کے لیے کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے؟ اور شعر و ادب اسلامی تحریک کا دلپذیر ہتھیار کیسے بن سکتے ہیں؟ آپ نے عمر بھر ان راہوں کو اپنے عمل سے ہموار و استوار کیا ہے۔ آپ نے زندگی کی ادبی راہگذر پر جو چراغ اپنے خونِ جگر سے روشن کیا تو اس سے باطل نظام کی اندھیری رات میں بے شمار تشنہ گانِ راہ متعین ہوئے اور اسلام کے جہانِ نو کا تصور نوجوانوں کے لیے اُجاگر ہوا۔ آپ نے افسانہ ناول، طنز، نظم، غزل، ڈرامہ غرض ہر صنفِ ادب میں اسلامی ادب کے ماڈل تیار کیے۔ جن سے کتنے ہی لکھنے والوں کو اسلامی ادب کا شعور حاصل ہوا۔ آپ کی اس جگر کاری سے نئے لکھنے والوں کی کھیپ کی کھیپ تیار ہوئی۔ آج اشتراکی ادب کے علمبردار جو ہمارے ہاں نام نہاد "ترقی پسند" کہلاتے ہیں۔ اب بالآخر ان کے ہاں بھی صنفِ نعت نے جگہ پا لی ہے اور جو لوگ صرف لینن اور سٹالن کی مدح میں لکھتے تھے وہ اب محسنِ انسانیت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نعت بھی لکھنے لگے ہیں۔ باطل کو میدان سے مکمل طور پر باہر دھکیلنا تو اس دنیا کی ترتیب و تخلیق کی غایت اور حکمت کے خلاف ہے۔ لیکن اسے کارِ نو کر کے اپنی بولی اس کی زبان سے بھی کہلوا لینا ایک بہت بڑی فتح ہے جو آپ نے حاصل کی ہے۔

ہماری ادبی تحریک کے اس چالیسویں سال میں بھی اپنے حلقۂ تعارف کے اندر

افسانہ و ناول و شعر کے بارے میں جائز و ناجائز کی بحث سے آپ بہت آزردہ ہیں لیکن میں عرض کروں کہ ایک خصوصی مذہبی پس منظر کے ساتھ یہ بحث بالکل ایک فطری امر ہے۔ مذہب کا جو تصور ہمارے انحطاط زدہ مسلم معاشرے میں دورِ ملوکیت سے رائج چلا آتا ہے وہ تصورِ زندگی میں مذہب کو صرف مسجد و محراب تک ہی محدود کرتا ہے۔ اگر یہ تصور مسلمان قبول نہ کرتے تو ان کی باطل سے سازگاری کے بجائے مسلسل جنگ رہتی جو اُن کے معاشرے میں خلافتِ راشدہ کے بعد سے پیہم غلبہ حاصل کر رہا تھا۔ اہلِ دین نے بلاشبہ ابتداء میں نفوذِ باطل کی زبردست مزاحمت کی، لیکن ملوکیت کے زبردست جبر و استبداد نے بالآخر دینی اقدار و تصورات کو مسجد و محراب تک سمٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ اور جب دینِ اسلام، حکومت کے ایوان، معیشت کے چیمبر، عدالت کی مسند، اور مقننہ کی مجلس سے نکل کر صرف مدرسہ تک ہی محدود ہو گیا تو اس کا ادب و ثقافت بھی پکی روٹی، قدوری، بیضاوی اور بہشتی زیور ہی رہ گیا۔ بس یہی اس کی ضرورت اور یہی اس کا نصاب اور کل اثاثہ رہ گیا۔ مسجد کی محراب میں محدود ہو کر اس کے پاس صرف ذکر و اذکار اور اوراد و وظائف ہی رہ سکتے تھے۔ باقی ساری دُنیوی زندگی تو اس کے دائرے سے آزاد ہو گئی تھی۔ یوں دینِ اسلام اسلامی تحریک کے ہمہ گیر و وسیع الاطراف مقامِ غلبہ سے اُتر کر "مذہب اسلام" کے روپ میں محدود ہو گیا۔ مسلمانوں کے پاس قرآن و سنت، اُسوۂ رسول اکرم اور صحابہ کرام کی درخشاں زندگیوں کی صورت میں بلاشبہ دینِ اسلام کا حقیقی روپ علم کی صورت میں کتابوں میں محفوظ رہا، لیکن غلبۂ باطل میں جس قدر دینِ اسلام سے ہٹ کر عمل کی صورت میں بچ سکا۔ بس وہ اسی قدر ہے جس سے باطل کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اسلام کے اسی موجودہ منجمد اور محدود روپ کو مسلمانوں کی موجودہ مذہب پسند نسلیں جانتی اور اپنے چاروں طرف موجود دیکھتی ہیں اور ان کے علم و خیال میں یہی کل اسلام ہے۔ یہ اسلام گذشتہ چند صدیوں سے مدرسہ و مسجد میں ہی محبوس چلا آ رہا ہے۔ جہاں شعر کا داخلہ ممنوع، افسانہ جھوٹ، ناول لہو الحدیث، اور ڈرامہ بھانڈ گری کا نام ہے۔

اس ماحول میں اسلام کا دلدادہ دیندار مسلمان زیادہ سے زیادہ مسجد میں آنے والوں پر یہ نگاہ رکھتا ہے کہ کسی کی کہنی ننگی نہ ہو تاکہ اس کی نماز مکروہ نہ ہو۔ کسی کی ڈاڑھی بقدر قبضہ سے کم نہ ہو، کسی کا انگوٹھا نمازیوں کی صف کی لکیر سے ذرا آگے یا پیچھے نہ ہو، اور کون یا رسول اللہ کا قائل ہے اور کون نہیں ہے؟ آٹھ تراویح کا کون قائل ہے اور بیس تراویح کا علمبردار کون ہے؟ کس کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے اور کس کے پیچھے نہیں ہوتی۔ کون ننگے سر نماز پڑھ رہا ہے اور کون رفع یدین کر کے وہابی بن گیا ہے؟ تاکہ اسے اپنی مسجد سے نکالا جائے۔ اور کسے صحابہ کا گستاخ قرار دیا جا سکتا ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک نوری تھا یا بشری تھا؟ آپ کی حیات و ممات کی حقیقت کیا ہے؟ حضرت مسیح مصلوب ہونے سے پہلے زندہ اُٹھا لیے گئے تھے یا تین دن بعد اُٹھائے گئے تھے؟ امام مہدی کب آئیں گے؟ اور کیسے ہوں گے؟ کون کافر ہے اور کون کافر نہیں ہے؟ علامہ اقبال نے اسلام بلا اقتدار کے دور میں جو مسائل مسلمانوں میں پیدا ہوتے ہیں ان کا نقشہ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کے ایک ممبر کی زبان سے ان الفاظ میں پیش کیا ہے ؎

ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے — ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے — یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں — یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

غرض مدرسہ و مسجد کے اسلام کی اصطلاحات، موضوعات، معقولات سب مخصوص اور اس کی ضروریات محدود ہیں، نہ کہ اس نے کسی کو اپنے دائرے میں داخل کی دعوت دینی ہے، نہ کہ اس کی سردردی کفار میں جا کر دعوتِ اسلامی کو پھیلانا ہے۔ نہ کہ اس کے پیشِ نظر کفار کے غلبہ کو ختم کر کے اپنے توحید و اعلیٰ تصورِ خدا کی حاکمیت کو نافذ کرنا ہے۔ اس مروجہ محدود تصورِ اسلام میں خلقِ خدا کے سامنے ہر سطح پر اور ہر سمت سے دعوتِ اسلامی پیش کرنا پیشِ نظر ہی نہیں ہے۔ اس لیے یہاں اسلامی دعوت کی مختلف ہیئتوں

اور طریقوں کو آزمانے، انسانی نفسیات کو متاثر کرنے اور اسلام کا تحریکی تصور پیش کر کے مسلمانوں کو غلبۂ اسلام پر آمادہ کرنے کا سوال ہی موجود نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ دعوتی اور تحریکی اسلام اور نسلی فقہی اور روایتی اسلام میں یہی بنیادی فرق ہے اس لیے نسلی اسلام کو کسی دعوتی ہتھیار کی ضرورت نہیں ہے اس کے لیے تو داخلی طور پر فرقوں کی گرم بازاری ہی بہت کافی ہے۔

مولانا مودودی مرحوم نے جب اسلام کا دعوتی اور تحریکی تصور پیش کر کے مسلمانوں کو اس کے غلبہ کے لیے جمع ہونے کی دعوت دی تو فطری طور پر سب سے پہلے مذہبی طبقہ نے ہی کھینچ کر اُدھر آنا تھا۔ اسلام کے غلبہ کا تصور یا دورِ خلفائے راشدین کے احیاء کا حسین و جمیل تصور تو خیالی سطح پر ہر مسلمان کو اپیل کرتا ہے۔ لیکن عملی زندگی میں رواجی مذہبی طبقے سے آنے والوں کا ذہنی اور روایتی پس منظر فقہی موشگافیوں کا ہی عادی ہوتا ہے۔ فرشتہ بھی فقہی دائرے میں ہی بنتے ہیں۔ یہ فقہی ذہن جہاں لاؤڈ سپیکر کے استعمال کے جواز و عدم جواز اور تصویر کے حلال و حرام پر بحث کرتا ہے وہاں وہ ادب کے مذہبی مقالات سے ہٹ کر افسانہ، شعر، ڈرامہ اور ناول کے جواز اور عدم جواز اور جائز و ناجائز کے بارے میں بھی بحث کرتا ہے۔ یہ بحث تو رواجی تصورِ اسلام کی فطری بحث ہے اور جب تک ان حضرات کا جدید علوم اور ان کی افادیت و ضرورت کے بارے میں ذہن صاف نہ ہو یہ بحث جاری رہے گی۔ چاہے نصف صدی بھی کیوں نہ گذر جائے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ تحریک کے داعی نے صرف مقالات کے ذریعے ہی اپنے دینی تصورات کو پیش کیا۔ چنانچہ ان سے متاثر ہونے والا ہر شخص مذہبی مقالات کے جواز کو تو صنفِ ادب کے طور پر خوب سمجھتا ہے۔ لیکن دیگر اصنافِ ادب کے بارے میں اس کے ذہن میں شبہات کا موجود ہونا فطری امر ہے۔ اس لیے کہ ہر شخص تو اجتہادی فکر کا مالک نہیں ہوتا۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ موجودہ اسلامی دعوت کا دور بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے شروع ہوتا ہے اور اس وقت شعر و ادب کی اصناف پر نام نہاد ترقی پسند اشتراکی تحریک

کا قبضہ تھا۔ چونکہ مسلمانوں کے معاشرے میں اشتراکیوں کے لیے مسلمانوں کو الحاد کی براہ راست دعوت دینے کا کوئی موقع نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ خدا کا انکار، الحاد کا پرچار، رسالت کا انکار، مستقل اخلاقی قدروں کا انکار، زندگی کے اعمال کے تعین میں آخرت کے تصور کا انکار یہ سب باتیں اگر مقالات میں براہ راست کہی جائیں تو مسلمان معاشرہ انہیں کبھی قبول نہ کرتا۔ اس لیے اشتراکیت کے داعیوں نے مسلمان معاشرے کو متاثر کرنے کے لیے ایک طرف صرف نوجوانوں کو نشانہ بنایا جو سادہ دل، علم دین سے بے خبر اور جذباتی ہوتے ہیں تو دوسری طرف اشتراکی دعوت کو براہ راست پیش کرنے کے بجائے شعروادب ڈرامہ و ناول کو اس کا ذریعہ بنایا تاکہ پہلے بالواسطہ اور تدریجی خوراکیں دے دے کر مسلمان نوجوانوں میں اشتراکیت کو زود ہضم بنایا جا سکے۔ یہ ان کی تبلیغ کی حکمت تھی۔ ان کا یہ دور ۱۹۳۶ء سے لے کر آج تک پھیلا ہوا ہے اور تقریباً انہوں نے اس فیلڈ پر مکمل قبضہ کیا ہوا ہے۔ ان کے وجود نامسعود نے دینداروں کی نظر میں شعروادب کو بھی مشتبہ بنا دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ادب کی ان اصناف کی حیثیت بھی اسلحہ کی سی ہے۔ اگر وہ دشمن کے ہاتھ میں ہے تو اس کا کام کرتا ہے اور اگر دوست کے ہاتھ میں ہے تو وہ دوستی بنھاتا ہے۔ جب دعوتِ اسلامی کے مخاطبین نے دعوت سے متاثر ہوتے ہی ان اصنافِ ادب کو دشمن کے ہاتھ میں دیکھا تو ان سا یہی تصور بن گیا کہ شاید ان اصناف کا مزاج ہی غیر اسلامی اور غیر اخلاقی ہے۔ حالانکہ ہتھیار کبھی غیر اسلامی نہیں ہوتا اس کا استعمال غیر اسلامی ہو سکتا ہے۔

اس بحث میں دل شکنی کا ایک پہلو جدید تعلیم گاہوں میں دعوتِ اسلامی سے متاثر نوجوانوں کا طرزِ عمل بھی ہے۔ وہ بھی نوجوان ہونے کے باوجود ان اصنافِ ادب سے اجتناب کرتے اور اس مؤثر ہتھیار کو دعوتِ اسلامی کے لیے استعمال کرنے کی حقیقی ضرورت سے بے نیاز اور شاید بے خبر بھی ہیں۔ ان کے تیار کردہ لٹریچر میں بھی تمام تر مقالاتی لٹریچر ہی ہے اور وہ دیگر اصنافِ ادب کا اگر ذوق بھی رکھیں تو اس کے لیے استفادہ

ترقی پسند ادیبوں یا ادب برائے ادب کا نظریہ رکھنے والے ادیبوں سے ہی کرتے ہیں۔ خود اپنے اندر سے ایسے افراد تیار کرنے اور ایسا لٹریچر تیار کرنے کی کوشش نہیں کرتے جو پاکیزہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ ان کے ہاں بھی ان اصنافِ ادب کے خلاف نادانستہ طور پر روایتی نوعیت کی رکاوٹ موجود ہے۔ ایک آدھ دفعہ میں نے توجہ دلائی ہے کہ ان کے اندر ان اصناف سے گریز کا پہلو واضح طور پر موجود ہے۔

یہ سارا پس منظر اسلامی دعوت کے میدان میں مقالے کے علاوہ دیگر اصناف سے استفادہ کرنے میں رکاوٹ اور جھجھک کا باعث بن رہا ہے۔

جس طرح غیر فعال غیر انقلابی منجمد مذہب کی روایتی چٹانوں کو آپ نے پیہم تحریکی ضربات سے توڑا۔ نظامِ اسلامی کا نعرہ بلند کیا۔ اور دعوتِ اسلامی کا چشمۂ صافی بہایا ہے۔ اسی طرح مایوس ہوئے بغیر دیگر اصنافِ ادب کے لیے اسلامی تحریک سے گنجائش پیدا کرنے کا کام ایک مسلسل جدوجہد کے ذریعے ہی ہوگا۔ اور آپ یہ فرض ادا کر ہی رہے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک خوش آئند پہلو بھی ہے یعنی ان رکاوٹوں کے باوجود تحریک اسلامی سے وابستہ خواتین کا ذہن اس مسئلے میں بالکل صاف ہے۔ ان کے جرائد میں تحریک کے لیے تفریحی ادب کا وافر ذخیرہ سامنے آتا رہتا ہے۔ عام طور پر بھی گذشتہ برسوں میں بتدریج انفرادی سطح پر یہ کام ہوتا رہا ہے۔ اگرچہ اس میں کسی منظم تحریک کا دخل نہیں رہا۔ لیکن صالح ادبی افکار مسلسل عمل کی صورت میں ڈھلتے رہے اور شعر، افسانہ و ناول تیار ہوتے رہے ہیں۔ خواتین میں سلمیٰ یا سمین نجمی کا کام اور مردوں میں خود آپ کا اور بعض دوسرے اصحابِ فن کا کام جو جریدہ ستیارہ کے ذریعے آتا اور جمع ہوتا رہا ہے خاصا وقیع ہے اور وافر بھی۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی ریسرچ سکالر گذشتہ ربع صدی میں اسلامی ادب کے میدان میں شعر و افسانہ، ناول و ڈرامہ کی اصناف پر ریسرچ کرے تو کتب و رسائل کی کافی طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے جس پر آپ کا دل مسرت محسوس کر سکتا ہے۔

اگر ادب میں اسلامی اقدار کو تسلیم کرنے والے اپنے لیے ایک مستقل ترجمان کا اہتمام کر سکتے۔ ایسے لٹریچر کا تعارف ہوتا۔ ایسے ادیبوں کے کام کا تعارف ہوتا اور ایسے ادب کی کتابی صورت میں اشاعت ہوتی تو آپ کو ادب کا یہ میدان دور دور تک سرسبز دکھائی دیتا۔

کیا اسلامی تحریک کے کارکنوں کو افسانہ و ادب و ناول کی اثر آفرینی کا ثبوت اس سے زائد بھی کوئی درکار ہے کہ جو طبقاتی احساس مسلمانوں کے اندر پیدا کرنے اور ان میں طبقاتی کشمکش اور تصادم پیدا کرنے کی کوشش اشتراکی ادیب گذشتہ نصف صدی سے کرتے رہے ہیں آج ان کی محنت کا رنگ آپ کے سامنے موجود ہے۔ انہوں نے اس طبقاتی احساس کو عوامی رنگ دے کر پیپلز پارٹی کی صفوں کو اپنے مطلوب کرداروں سے بھر دیا ہے۔ ان ادیبوں نے طبقاتی نعرے لگانے والے کارکن پیپلز پارٹی کو فراہم کیے ہیں۔ ان ادیبوں کا کیا ہوا کام ضائع نہیں ہوا ہے۔ جو اخلاق انہوں نے پیدا کرنے کی کوشش کی تھی وہ اخلاق اب پیپلز پارٹی کی صفوں میں پوری طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ جو مادی قدریں انہوں نے ابھاری تھیں وہ قدریں روٹی، کپڑا، مکان کے نعروں میں مربوط دیکھی جا سکتی ہیں۔ جو حسد و بغض، جلن اور کڑھن کے طبقاتی بیج انہوں نے بوئے تھے وہ آج پیپلز پارٹی کے لیڈروں اور کارکنوں کی گالیوں میں تناور درخت بنے ہوئے اپنے زہریلے پھل معاشرے کو دے رہے ہیں۔ افسانہ و ناول اور شعر و ڈرامہ کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اشتراکی سیاسی تحریک تو سیاسی میدان میں چار قدم بھی آگے نہ چل سکی تھی۔ یہ سارا کام تو اشتراکی ادیبوں کا ہی کیا ہوا ہمارے سامنے ہے۔

بہرحال ہمارے معاشرے میں اشتراکیوں نے مقالات کے ذریعے اپنی دعوت پیش کرنے کی بجائے شعر، افسانہ و ناول کو جو ذریعہ بنایا تو اس کی اثر پذیری آج سب کے سامنے ہے۔ آج وہ اپنی نظریاتی تفریحی، اشتراکی ادبی تحریک کی گولڈن جوبلی منا رہے ہیں، اور حقیقتاً ان کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ ان کا کیا ہوا کام معاشرے میں ایسا رنگ لایا ہے کہ جس معاشرے میں مسلمان اپنے مسلمان بھائی پر طرابلس اور ترکی میں بھی ظلم ہو تو تڑپ

اُٹھتے تھے وہاں اُن کا ادب پر قبضہ اس درجے کا ہوا ہے کہ ویت نام میں اشتراکی نظریات کے حق میں کوئی جنگ آزما ہو تو پاکستانی ادیب اس پر تڑپ اُٹھتے ہیں اور شعر و ادب سے ویت نام کے لوگوں کو زندۂ جاوید بنا دیتے ہیں اور ویت نام کے مظلوموں کے دکھ پر آنسوؤں کے دریا بہا دیتے ہیں۔ لیکن اگر افغانستان میں خود روس مسلمانوں پر حملہ آور ہوتا ہے اور وہاں کے مسلمان بچوں پر کھلونوں کے بم پھینکتا ہے، چالیس لاکھ مسلمانوں کو بے گھر کرتا ہے۔ دس لاکھ مسلمانوں کو دنیا کے سامنے ذبح کر دیتا اور کھلم کھلا پُرامن نہتی مسلمان بستیوں پر بمباری کرتا اور برسوں کرتا چلا جاتا ہے تو مسلمان معاشرے کے اشتراکی ادیبوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی، نہ اُن کی آنکھ افغان مسلمان بیوہ کے دکھ پر نم ہوتی ہے اس لیے کہ اُسے ان کے محبوب روسی بم نے بے گھر کیا۔ اور اس کے شوہر کو ان کے محبوب روسی سپاہی نے شہید کیا ہے۔ ان کی زبانیں گنگ اور ان کے قلم زنگ آلود ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اُلٹا وہ یہ مطالبہ اُٹھاتے ہیں کہ ان بے گھر مظلوم مسلمانوں کو واپس روسیوں کے ٹینکوں کے سامنے دھکیلا جائے تاکہ ان کی ہڈیوں پر وہ ٹینک دوڑا سکیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ پاکستان خود جا کر روس کی کٹھ پتلی ببرک کارمل سے معانقہ اور مصافحہ کرے اور اس سے روس کی غلامی میں جانے کا نسخہ معلوم کرے۔ اس سے زیادہ تیرہ بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اب خود مسلمانوں میں سے اپنی ضرورت کے لوگ روس کو مل رہے ہیں، جو مسلمانوں کو اس کی غلامی میں براہ راست دھکیلنا چاہتے ہیں۔ یہ سب انہی اشتراکی ادیبوں کی قلمکاری کا ہی تو نتیجہ ہے۔

یہ سب باتیں ان لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہونی چاہییں جو تحریکِ اسلامی کے اندر شعر و ادب اور افسانہ و ناول کے جائز و ناجائز کی بحثوں میں اب تک پڑے ہوئے ہیں۔ بسم اللہ کا گنبد اس کے سوا اور کونسا ہوتا ہے کہ دشمن آپ کے سر پہ کھڑا ہے اور آپ بندوق کے استعمال کے بارے میں فقہی جواز و عدم جواز کی بحث فرما رہے ہیں۔

برادرم محترم!

میں نے آپ کے رسائل و مسائل کی لہو الحدیث کی بحث کے بارے میں جو یہ گفتگو کی ہے تو اس کی شرعی اور فقہی حیثیت پر آپ نے اس پر پہلے ہی کافی کلام کیا ہے اور وہ بہت کافی ہے۔ یہ تو وہ وہی دورِ حاضر میں سواری کے لیے ریل گاڑی کے استعمال کے جواز و عدم جواز کی بحث کے مترادف ہے۔ بہرحال میں نے منتشر طور پر صرف دردِ دل کی چند باتیں عرض کی ہیں۔ آپ کی اس تشویش میں برابر کا شریک ہوں کہ:

"اب مجھے یہی تشویش ہے کہ کچھ عرصہ بعد اس پسپائی کا احساس ہوگا جو ادبی کام کی کوتاہی کی وجہ سے غیر محسوس طور پر واقع ہو رہی ہے اور ایک ایک دن اس کی کمی کی تلافی کا جذبہ بیدار ہوگا۔"

میرا خیال ہے کہ اب اس جذبے کی بیداری میں مزید تاخیر مہلک ہوگی۔ میری بھی یہی دعا ہے کہ ہمارے نوجوانوں اور نئے لکھنے والوں میں ادبی میدان میں کام کی کمی کا احساس زیاں بیدار ہو۔ اور وہ آگے بڑھ کر اس خلاء کو پورا کریں۔ خواتین اور طالبات میں اس کا احساس و شعور موجود ہے اور مزید اُجاگر ہو گیا ہے۔ پھر ان کے ہاں خاصا کام بھی ہو رہا ہے۔ لیکن مردوں میں یہ پہلو تشنہ ہی نہیں مجرمانہ حد تک کوتاہی کا شکار ہو گیا ہے۔

میں آپ سے درخواست کروں گا کہ کوئی ایک وسیع تر مجلسِ مشاورت بلائیے جو اس پہلو پر کام کا نقشہ سوچے تاکہ اس ویرانے میں بھی اذان کی آواز گونجے۔ جیلانی بی۔اے نے ایک بار اس ویرانے میں ایک اذان دی تھی لیکن جب انہوں نے اپنے پیچھے صف میں چار آدمی بھی جمع نہ پائے تو بیٹھ پھیر کر واپس چلے گئے۔ بہرحال اس راہ گذر پر نئے چراغ روشن کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ میں اپنا خونِ جگر اس چراغ کی لو تیز کرنے کے لیے پیش کرنے کو تیار ہوں۔

۲۔ گیلانی صاحب کے خط کا جواب از نعیم صدیقی

برادرم اسعد گیلانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکتوب کیا ملا، گویا دبستان کھل گیا۔ آپ نے جو کچھ لکھا، سب اچھا ہی اچھا ہے،

اس کے متعلق کیا لکھوں ۔ دو ایک جگہ میرے اور آپ کے خیالات کی رَو میں کچھ کچھ الگ ہوتی ہیں ۔ ان پر بات کر لیتے ہیں ۔ دو تین نکات :۔

۱ ۔ آپ نے "لہو الحدیث" کے سلسلے میں میری گذارشات کی جو تحسین فرمائی اس کے لیے صد گونہ سپاس ۔

۲ ۔ لیکن میں اپنے لیے حسرت و یاس کا الزام قبول نہیں کر سکتا ۔ اس لیے کہ اگر مجھے یہ روگ لگتا ۔ تو میرے قلم کی نوک اگر ٹوٹ نہ جاتی تو اسے زنگ ضرور لگ جاتا ۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں برابر لکھ رہا ہوں ۔ ادب اور شعر لکھ رہا ہوں ۔

دراصل حسرت و یاس کا ترجمہ آپ نے اپنی تحریر کے آخر میں خود ہی "تشویش" کے لفظ سے کر دیا ہے ۔

۳ ۔ میرا کہنا یہ بھی نہیں کہ اسلامی روحِ فکر کو اُبھارنے والی ادبی تحریک کام نہیں کر رہی اور نظم و نثر میں ہماری تہذیبی اخلاقی قدریں اُبھر نہیں رہیں ۔

۴ ۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ تحریکِ اسلامی کے وابستگان ۔ اُوپر سے لے کر نیچے تک ۔ (آپ اور دوسرے چند خاص خاص اربابِ احساس کو چھوڑ کر) ادب کی تحریکی حیثیت اور دُنیا بھر میں ادبی نظریات کے تصادم اور ادبی کام کی انقلابی اہمیت جیسے موضوعات پر حاوی ہونا تو کجا ، ادب (خصوصاً براہ راست قسم کی خطابت و مضمون نویسی سے ہٹا ہوا ادب) سے پوری طرح حظ اندوز بھی نہیں ہو سکتے ۔ ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ جو کام صراحت کے انداز سے بصد مشکل چل رہا ہے وہ کنایت کے انداز سے کیسے آگے بڑھے گا ۔

ہمارے پاس اوّل درجے کا ناقد ناپید ہے بلکہ دوسرے درجے کے ایسے ناقد بھی نہیں ہیں جو کام کرنے والوں کے کسی فن پارے ، کسی کتاب یا کسی نظریے پر چار سطریں لکھ سکیں ۔ ناشر نہیں ہیں جو ادبی اور شعری مواد اشاعت کے لیے طلب کریں ۔ ایسے پڑھنے والے کثیر تعداد میں نہیں ہیں جن کی پسند و ناپسند ہمیں آگاہ رکھے کہ کس طرح کا سوچنا اور کس طرح کا لکھنا مناسب ہوگا یا گوارا ہوگا ۔ ان کوتاہیوں کو محض یہ تصور پورا نہیں

کر سکتا ہے کہ پوری ایک کھیپ تیار ہو گئی ہے۔

اب، اگر ان حقائق کو کوئی دیکھتا اور محسوس کرتا ہو اور بیان کرے تو آپ اُسے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ نا امیدی و حسرت و یاس کی زد میں آگیا ہے۔ بلکہ یہ ایسی ہی بات ہے کہ ایک آدمی دیکھتا ہے کہ ایک چمن میں ایک خاص طرح کے پھول نہیں ہیں تو وہ یہی کہے گا کہ "نہیں ہیں" ـــــ آخر وہ ان کو "ہیں" کس طرح کہہ دے؟ ایک گاڑی کے ایک پہیے میں ہوا نہیں ہے۔ آخر گاڑی سے محبت کرنے والا بھی یہ کیسے کہے کہ اس میں ہوا ہے؟

۵ ـــ میری کتابوں میں جو کمیونسٹ لٹریچر پڑا ہے اُس میں لینن کے خیالات آرٹ پر بڑی تفصیل سے موجود ہیں۔ دوسرے دانشور اشتراکی لیڈروں کے بھی۔ دراصل وہ لوگ پہلے دن سے اپنی نظریاتی تحریک کے ساتھ یہ سوچ کے چلے تھے کہ فلسفہ تاریخ کونسا چاہیے، صحافت سے کس طرح کام لینا ہے، ادب کی گاڑی کس طرح چلے گی۔ مزدوروں اور کسانوں کی قوت سے کس طرح کام لیا جائے گا۔ ہمارے یہاں بہت کچھ سوچ لیا گیا اور بہت کچھ نہیں سوچا گیا۔

۶ ـــ یہ تو ٹھیک ہے کہ جدید دور کی مخصوص ادبی تحریکات (خصوصاً ترقی پسند اشتراکی تحریک) نئی چیزیں ہیں، مگر یہ غلط فہمی قارئین کو آپ کی تحریر سے نہ ہو کہ ہمارے ہاں پہلے سے اس سلسلے میں کوئی کام اور کام کی لکیر موجود ہی نہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر ادب کی قوت کا کون شناسا ہوگا، جنہوں نے اپنے ایک اُمتی شاعر (حسانؓ بن ثابت) کو منبر پر بٹھا کر شعر پڑھوائے۔ اور جبریل امین کی تائید کی بشارت دی اور کعبؓ بن زہیر کا قصیدہ سن کر چادر اُتار کے دے دی۔ قرونِ اُولیٰ میں ہر واقعہ کے متعلق ادبی و شعری ریکارڈ موجود ہے بلکہ بعد کی ساری تاریخ میں رہا۔ ایران میں اسلام گیا تو شعر و ادب کے دھارے کا رُخ بدل گیا۔ برصغیر میں غالبؔ سے اقبالؔ تک اور عبدالحلیم شررؔ سے مولانا مودودیؒ تک جو عظیم الشان پیش رفت ہوئی اُسے بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ میں نے جو بات چھیڑی تھی کہ تحریکِ اسلامی کے ادب میں نفوذ اور

اس کے فہم و شعور کے متعلق تھی۔

اب آپ جس طرز کا کام کرنے پر تیار رہیں وہ اس طرح کا نہیں کہ آپ کا اصل کام ہی تخلیق ادب ہو، بلکہ آپ اصل میں تو جماعت کی قیادت، اسمبلی کی رکنیت اور عام کتاب نویسی اور مقالات نگاری اور خطابت کا کام کریں گے، ضمناً کبھی ادب کے نام پر بھی پھینک دیا کریں گے۔ (اور یہی ہم سب کرتے ہیں)۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ اس طرح وہ ادبی تحریک نہیں چلتی جو ادبی لیڈرشپ آپ کی طرف منتقل کر دے۔ ہمیں صرف ادب کی ضرورت نہیں، ادبی لیڈرشپ کی ضرورت ہے، تب ہمارے بڑے نصب العین کو تقویت ملتی ہے۔

ایسے ادبی کام کے لیے جس طرح کے سوچنے والے ذہن چاہئیں، ہمارے پاس کم ہیں۔ زیادہ ہوتے تو وہ میرے آپ کے کہے بغیر کام کا راستہ سمجھ لیتے اور گاڑی چل کر آگے تک جا چکی ہوتی۔

یہاں تو حال یہ ہے کہ بالعموم ادب کو سیاست کاری کے تابع رکھنا پسند کیا جاتا ہے حالانکہ اچھے ادب کا نشوونما اس طرح ہوتا ہی نہیں کہ اپنے عقیدے کے فطری اظہار کے بجائے آدمی بنے بنائے چینلز میں سوچے۔ میرا ذہن تو اس کو گوارا نہیں کرتا کہ کوئی غیر ادبی شخصیت ادبی کام کرنے کے لیے اُٹھے یا ادبی خدمات سے تہی دامن کوئی شخص ادبی اسٹیج پہ جلوہ گر ہو۔ اسی طرح نمایاں سیاسی اکابر کو ادبی تنظیموں کی کشتیوں کا ناخدا نہیں بننا چاہیے۔ کیونکہ اس طرح سے سیاست والا تعصب اُدھر بھی اثر انداز ہو جاتا ہے۔

یہ باتیں میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ غلطیٔ فکر کے پہلو واضح ہو جائیں تاکہ آئندہ لوگ بہتر کام کر سکیں۔

۸۔ دائرۂ ادب میں بہتر کام انجام دینے والوں کی بڑی اہمیت محسوس کی جانی چاہیے ادب کی ویلیو (VALUE) بڑھانی چاہیے۔ اچھے ادب کی تخلیق کے لیے ہمارے ممتاز اصحاب کو بات کرنی چاہیے۔ لیڈروں کو اچھی ادبی تحریریں اور اشعار پڑھنے چاہئیں جو لوگ اسلامی خطوطِ فکر پہ کام کرتے ہوئے کوئی اچھا قدم آگے بڑھائیں ان کو داد

دی جانی چاہیے۔ اچھی کتابیں لکھنے والوں کو خطوط لکھنے چاہئیں۔ اِس طرح وہ فضا پیدا ہوگی کہ نوجوان قوت ادب میں سر اُبھارنے لگے۔

۹۔ مسئلہ جذبہ پیدا کرنے تک محدود نہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں میں ذوقِ ادب بڑھے، ذوقِ ادب مطالعۂ ادب سے بڑھتا ہے، اچھے ادب پاروں، اچھی کتابوں اور اچھے ادیبوں کے حوالے سے بڑھتا ہے۔ لوگوں میں ادب شناسی اور ادب سے حظ اُٹھانے کا ملکہ ہونا چاہیے۔

ہمارا ناکام طریقِ کار اس پہلو سے یہ رہا کہ کسی بھی طرح کے اجتماع کو پروگرام کا ایک سوچ گھما کر مشاعرہ بنا دیا یا ادبی اجلاس قرار دے دیا۔ حالانکہ ادب کا قاری اور ادب کا سامع بننے کے لیے بھی خاصی محنت و کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کام کے لیے کاش کوئی تربیت گاہ سال چھ ماہ مسلسل ایک ایک کلاس کو تیار کرتی رہے۔

۱۰۔ بہرحال جہاں تک آپ کے نیک عزم کا تعلق ہے، آپ آگے چلیں، ہم بھی ساتھ ساتھ گھسٹتے چلیں گے۔ انکار کی کہاں مجال! آگے چلنے کے بعض مواقع آئے، مگر میں اپنے ادبی شعور و فہم کی وجہ سے مجبور تھا کہ اگر اپنی شرائط پر چل چلا نہ سکوں تو تنہا کام کرتا رہوں۔ اپنی حد تک مجھے کوئی مایوسی نہیں ہے نہ کسی طرح کی حسرت!